بہت ہی نمایاں، واضح، کھلی اور کٹھن آزمائش تھی"۔

پس معلوم ہوا کہ خالقِ کائنات کی طرف سے موت وحیات کا یہ نظام ابتلاء، آزمائش، امتحان اور جانچنے اور پرکھنے کے لئے تخلیق فرمایا گیا ہے۔ ساتھ ہی اسی آیت میں اس جانچ اور پرکھ کی غایت بھی بیان کردی گئی کہ ﴿ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلاً ﴾ یعنی وہ (اللہ تعالیٰ) یہ دیکھے کہ تم میں سے کون بہتر عمل کرتا ہے۔ تم جو اس دنیا میں اپنے خالق کی ذات سے محجوب کردیئے گئے ہو اور اصل حقائق تمہاری نگاہوں سے اوجھل کردیئے گئے ہیں۔ حقیقت الحقائق ذاتِ باری تعالیٰ ہے ﴿ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ ﴾ الحق اللہ کی ذات ہے اور وہ آنکھوں سے اوجھل ہے۔ اب تمہاری آزمائش اور تمہارا امتحان اس میں ہے کہ ہم نے تم کو جو استعدادات دی ہیں، عقل، نظر اور تفکر و تدبّر کی جو صلاحتیں عطا کی ہیں، جو بصیرتِ باطنی عنایت کی ہے، تو ایک تو ان کے ذریعے ہم کو پہچانو۔ ان آنکھوں سے دیکھے بغیر دل کی آنکھوں سے ہمیں دیکھو اور ہماری معرفت حاصل کرو —— پہلی آزمائش یہ ہے۔ یہ تو گویا نظری، فکری، عقلی اور علمی آزمائش ہے کہ آیا تم حجابات ہی سے محجوب ہو کر رہ جاتے ہو، پردوں ہی کے نقش و نگار دیکھنے میں محو ہو جاتے ہو، یہیں کی ظاہری آرائش و زیبائش تمہیں مبہوت کردیتی ہے اور تم اسی کے اندر گم ہو کر رہ جاتے ہو، جس کو علامہ اقبال مرحوم نے یوں تعبیر کیا ہے کہ ع "کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے" ہم نے تمہیں پردوں میں رکھا ہے۔ پھر پردے بھی بڑے خوش نما ہیں۔ اس زمین میں جو کچھ ہے اس کو ہم نے اس کی زینت کے لئے بنایا ہے۔ ﴿ اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا ﴾ گویا اس کائنات میں جو کچھ ہے وہ دراصل اس زمین کی زیبائش و آرائش اور سنگھار ہے۔ اس میں بھی ایک آزمائش ہے، ابتلاء ہے، امتحان ہے۔ تو پہلی آزمائش عقل اور فکر و نظر کی آزمائش ہے۔ انسانی کی جو قوّتِ نظری ہے اس کا امتحان ہے کہ یہ انسان اپنے رب، مالک اور خالق کو پہچانتا ہے یا نہیں —— جبکہ دوسری آزمائش انسان کے ارادے، عمل اور سیرت و کردار کی پختگی سے متعلق ہے۔

اب اگر اپنے مالک و خالق حقیقی کو پہچان لیا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلنا چاہئے کہ انسان اسی سے دل لگائے' اسی سے لَو لگائے' اسی کو مطلوب و مقصود بنائے' اس کی عبادت و اطاعت کرے۔ اب قدم قدم پر امتحانات آئیں گے۔ دنیا کی چیزیں انسان کو اپنی طرف کھینچیں گی۔ بقولِ شاعر ؎ "اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے!" وہ ان آرائشوں اور زیبائشوں کی طرف توجہ کرتا ہے یا ہماری طرف متوجّہ ہوتا ہے۔ ان کو مطلوب و مقصود سمجھتا ہے یا ہمیں مطلوب و مقصود بناتا ہے۔ اگر اس کے سامنے یہ متبادل (alternative) راستے رکھ دیئے جائیں کہ یا اللہ کے راستے کو چھوڑ دو یا اپنے عزیزوں کو چھوڑو' وطن کو خیرباد کہہ دو' تو دیکھیں وہ کون سا راستہ اختیار کرتا ہے۔ وہ وطن اور اپنے اعزّہ و اقارب کے حق میں فیصلہ کرتا ہے یا اللہ کے حق میں فیصلہ کرتا ہے! اگر اس کے سامنے یہ دوراہا آجاتا ہے کہ یا والدین کو چھوڑے یا اللہ کی توحید کو چھوڑے' تو دیکھیں کہ کس کو چھوڑتا ہے! اگر اس کے سامنے یہ معاملہ آجائے کہ اپنی زندگی کی قربانی قبول کرے یا اللہ کے ساتھ اپنے تعلق کا رشتہ توڑ دے اور معبودانِ باطل کی پرستش کرنے لگے' تو دیکھیں کہ اس کے بارے میں اس کا فیصلہ کیا ہوتا ہے؟ —— اور اگر اس کے سامنے یہ مرحلہ آجائے کہ دنیا کی جو محبوب ترین شے ہو سکتی ہے اس کی محبّت اور اللہ کی محبّت کے درمیان فیصلہ کرنے کو کہا جائے تو دیکھیں وہ کدھر کا رُخ کرتا ہے ؎

رخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے!

یہ کُل امتحان ہے —— جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ پہلا امتحان عقل و فکر کا امتحان ہے۔

دوسرا امتحان ارادے' نیت' سیرت و کردار اور عمل کا امتحان ہے۔ تو یہ ہے امتحان اور یہ ہے زندگی کی اصل غرض و غایت ﴿ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۭ ﴾ —— اس کی ترجمانی بھی علامہ اقبال مرحوم نے بڑی

خوبصورتی سے کی ہے۔ وہ کہتے ہیں ؎

قلزمِ ہستی سے تو اُبھرا ہے مانند حباب!
اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی!

یہ جو ہماری زندگی ہے یہ حباب کی مانند ہے' بڑی عارضی' بڑی فانی' پانی کا بلبلہ' جو اَب پھٹا کہ اب پھٹا۔ بلبلے کی اس سے زیادہ اور کیا حیثیت ہے۔ اس حیاتِ دُنیوی کی پائیداری پر کوئی اعتماد نہیں ہو سکتا کہ یہ کب تک رہے گی۔ لیکن جتنی دیر بھی یہ بلبلہ قائم رہے اس کی بھی ایک غرض و غایت ہے۔ وہ بھی عبث نہیں ہے۔ ذرا اس کائنات کی وسعتوں کا تصور کیجئے' جس کو علامہ مرحوم نے اس شعر میں قلزم سے تعبیر کیا ہے۔ پس یہ زندگی ایک آزمائش اور امتحان سے زیادہ کوئی حیثیت اور وقعت نہیں رکھتی ؎

یہ گھڑی محشر کی ہے تُو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے!

حیاتِ ابراہیمیؑ : امتحان و آزمائش کی مثالِ کامل

اس امتحان کی جو کامل و مکمل مثال قرآن مجید پیش کرتا ہے وہ حضرت ابراہیم (علیٰ نبینا وعلیہ السلام) کی زندگی ہے۔ چنانچہ سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۲۴ کا آغاز ان الفاظ میں ہوتا ہے : ﴿وَاِذِ ابْتَلٰٓی اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ﴾ "اور یاد کرو کہ جب آزمایا ابراہیم کو اس کے رب نے بڑی بڑی باتوں میں تو وہ ان سب میں پورا اتر گیا" —— یہاں لفظ ابتلاء آگیا۔ اس کے معنی ہیں کسی کو آزمانا' امتحان و آزمائش میں ڈالنا —— یہاں لفظ بِكَلِمٰتٍ میں تنوین تنکیر کے لئے آئی ہے' یعنی اس نے اس کو نکرہ بنا دیا ہے' اور تنکیر عربی زبان میں تفخیم کے لئے یعنی کسی چیز کی عظمت و شان کو بیان کرنے کے لئے آتی ہے۔ چنانچہ بِكَلِمٰتٍ میں بڑے بڑے اور کٹھن امتحانات کا مفہوم شامل ہو گیا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس کے رب نے بڑے سخت اور مشکل امتحانات لئے' لیکن اس اللہ کے بندے نے سب کو پورا کر دکھایا۔ فَاَتَمَّهُنَّ۔